© rasailojaraid.com

مُظفّر حسین

خُودی اور آخرت

علّامہ اقبالؒ نے اسلامی نظریات اور تصوّرات کو ایک بالکل نئے اور انوکھے علمی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی جدّتِ افکار کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم لکھتے ہیں "وہ خاتم الانبیاء جنہوں نے نوعِ انسانی کو حقیقتِ کائنات کا کامل تصور عطا کیا، جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں اور وہ فلسفی جس نے علمی حقائق کی ترقیوں کے اِس دَور میں سب سے پہلے اپنے فلسفہ کی بنیاد نبوّتِ کاملہ کے عطا کیے ہوئے تصوّرِ حقیقت پر رکھی ہے اقبالؒ ہے۔ چنانچہ تعلیمِ نبوت اور فلسفہ کے اس اتصال کو آپ انسان کے علمی ارتقاء کا ایک بہت بڑا واقعہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے خاص ذہنی حالات، خاص علمی ماحول اور مقام کی بنا پر اقبالؒ کے فلسفہ کو جو خصوصیات حاصل ہوئی ہیں وہ آج سے پہلے کسی مسلمان فلسفی (محی الدین ابنِ عربی اور شاہ ولی اللہ سمیت) کو نہ حاصل ہو سکتی تھیں اور نہ ہی حاصل ہو سکی ہیں۔ دوسرے تمام مسلمان فلسفیوں کے فلسفے فلسفۂ ارتقاء کے وہ مراحل ہیں جو گزر چکے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ ان تمام مراحل سے آگے کا فلسفہ ہے جو گذشتہ مراحل کے تمام حاصلات کو اپنے اندر جمع کرتا ہے لیکن اب گزشتہ مرحلوں میں سے کوئی مرحلہ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ نہیں لے سکتا"[1]

علّامہ اقبالؒ کی یہ عظمت بجا، تاہم اپنی جگہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے خالص قرآنی پیغام کے ابلاغ میں جہاں ان کی شاعری کی دل نشینی اور ان کے فلسفہ کی خرد گیری سے انکار ممکن نہیں وہاں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات شعر و فلسفہ ہی ان کے پیغام کے ابلاغ میں رکاوٹ بھی بن جاتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں یہی وجہ ہے کہ "خودی" کی فلسفیانہ اصطلاح متعلّمینِ اقبالیات میں آج تک باعثِ نزاع بنی ہوئی ہے اور معدودے چند لوگوں نے ہی اس کے حقیقی مفہوم سے آگاہی حاصل کی ہے۔ اسی طرح "عشق" کی شاعرانہ علامت کے حقیقی مطالب سے بھی اکثر و بیشتر اقبالیئین بے خبر پائے گئے ہیں۔ بالعموم ان نارسائیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے افکار کو فلسفہ یا شعر کے حوالے ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ ان کا اپنا موقف اس کے بالکل برعکس "بہتر ہے از اسرارِ قرآں گفتمش" کا ہے۔ انہیں اصرار ہے کہ ان کی فکر قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ پھر بھی بعض شارحینِ اقبالیات کے نزدیک علامہ اقبالؒ نے بعض محکمات دینی کے بیان کے سلسلے میں اپنی فلسفیانہ اپچ میں قرآنی تعلیمات کو نظر انداز کر دیا ہے انہی محکمات میں قرآنِ حکیم کا تصورِ آخرت بھی شامل ہے۔ وحیدُ الدین اپنی کتاب "ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کا فلسفہ" میں تحریر فرماتے ہیں [۱۳]:-

"اقبال کا تصورِ حیات مابعد الموت راسخ العقیدہ اسلامی نظریات سے سنگین انحراف ہے۔"

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اپنے مقالہ "انا اور اس کی بقا" [۱۴] میں رقمطراز ہیں:-

"علامہ اقبال کے نزدیک انا بقائے دوام کی خصوصیت سے بالفعل متصف نہیں ہے البتہ اس میں بقائے دوام کی صلاحیت موجود ہے وہ بقائے دوام کی امیدوار ہے اور عظیم کاموں کی انجام دہی سے اسے دوام حاصل ہوتا ہے اور بعض اعمال ہیں جو وجودِ انا کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں اور اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال کے نزدیک سعی و عمل ہی سے یہ وثوق پیدا ہوتا ہے کہ انا غیر فانی ہے اور وجدان سے اس کی ذاتی بقا ہم پر منکشف ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے عمل سے اپنے شعور کو بالیدہ اور توانا کرتے ہیں اور یہ عمل ہی سے ممکن ہے کہ ہم اپنے آپ کو کامل اور غیر فانی بنالیں۔"

علامہ اقبالؒ کے ان خیالات پر گرفت فرماتے ہوئے وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"یہ نتیجہ کہ فی الحقیقت انا غیر فانی نہیں بلکہ غیر فانی ہو سکتی ہے عملی جدوجہد کے لیے ایک ترغیب تو رکھتا ہے مگر یہ بات محلِ نظر ہے کہ بقائے انا کا یہ تصور مذہب کے ساتھ بھی سازگار ہے۔"

آپ کو اس پر اعتراض یہ ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"مذہب کو حیات بعد الموت پر اس لیے اصرار ہے کہ اعمال کی باز پرس اور حساب وہی ممکن ہو اور اعمال کے نتائج اپنے اِتمام کو پہنچ سکیں، اس لیے اچھے یا بُرے انسان کا اس شعور عینیت کے ساتھ دوبارہ زندہ ہونا درکار ہے کہ وہ یہ جانے کہ یہ میں وہی ہوں جس نے یہ عمل کیے تھے اور اب ان کا مجھے مناسب بدلہ ملے گا، لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ جو اعمال روح کے لیے ہلاکت انگیز ہیں ان کا مرتکب باز پُرس سے چھوٹ گیا۔ حالانکہ علامہ اقبال کے مذہبی رجحانات کے پیشِ نظر ہم حتمیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی دلیل کے اس نتیجہ کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں جاننا چاہیے کہ فلسفے پر مذہب کی بنیاد رکھنا ایک فلسفیانہ اپج اور علمی امنگ تو ہو سکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس جدوجہد سے نتیجہ خالص مذہبی فکر کے مطابق ہو۔"

اور آخر میں علامہ اقبالؒ کی وکالت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں:۔

"علامہ اقبال کے آخری دورِ فکر میں جہاں ان کا مذہبی موقف یہ ہے کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ فلسفہ اور مذہب کی تطبیق کے ضمن میں اس قسم کے نتائج بالآخر علامہ اقبال کے نزدیک بھی حتمی نہیں تھے کیونکہ وہ خود "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ فلسفیانہ فکر میں حتمیت، اور قطعیت کوئی چیز نہیں ہے۔"

اسی طرح بعض دوسرے شارحینِ اقبال کے نزدیک علامہ اقبالؒ کا یہ نظریہ کہ جنت اور دوزخ احوال ہیں نہ کہ مقامات، قرآنی تعلیمات کے صریحاً متناقض ہے،

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مذہبی حقائق کو فلسفیانہ اور شاعرانہ زبان میں پیش کر کے فلسفہ کی عقلی اپیل اور شاعری کی جذباتی تحریک دونوں سے کام لیا جس کا مقصد اُمتِ مُسلمہ کو عمل پر اُبھارنا تھا۔

من بطبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف   کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف

حرفِ پیچا پیچ و حرفِ نیش دار   تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار

لیکن ایسا کرنے میں جو اصول آپ نے پیشِ نظر رکھا وہ یہی تھا کہ فلسفہ کو مذہب پر فوقیت نہ دی جائے آپ فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"بے شک فلسفہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مذہب پر حکم لگائے مگر جس چیز پر حکم لگانا مقصود ہے اس کی ماہیت ہی ایسی ہے کہ فلسفہ کا یہ حق تسلیم کرے گی تو انہی شرائط کے تحت جن کو اس نے خود متعین کیا ہے [۵۵]"

چنانچہ وہ مذہب کا جوہر "ایمان" قرار دیتے ہیں جو ایک پرند کی طرح اپنا "بے نشان" راستا دیکھ لیتا ہے [۵۶]۔ اگرچہ آپ کے نزدیک مذہب کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ہماری واردات اور تجربات کی دنیا میں پائے جانے والے اضداد کو باہم تطبیق دے کیونکہ ایک مشتبہ اصول اعمال و افعال کی بنیاد نہیں بن سکتا [۵۷]۔ اسی لیے آپ نے مذہبی حقائق کی فلسفیانہ تاویل کی جو کاوش کی ہے اس کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عقل و دل و نگاہ کی رہنمائی حقائق ایمان تک کی جائے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے دورِ حاضر میں مذہبی معتقدات کے خلاف عقل کی بغاوت کو فرد کرنے کے لیے اسلامی افکار سے ایک نیا فلسفہ وضع کیا ہے اور ایمان کے اس مقام پر ہیں جہاں عقل کے لیے ان کے بام و در کا طواف خود عقل کی سعادت ہے [۵۸]۔

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولائتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

بآں مقام رسیدم چو در برش کردم
طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

غرض علامہ اقبال فلسفہ کو اپنا امام نہیں بلکہ غلام اور شاعری کو "اسرارِ قرآن" بیان کرنے کا محض ایک اثر انگیز وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنے دینی نظریات او تصورات کی صداقت پر آپ کے یقین کا یہ عالم ہے کہ رحمۃ للعالمین کے حضور عرض حال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر آپ کے اشعار میں قرآنی حقائق کے خلاف کوئی بات بیان ہوئی ہو تو ان کی ناموسِ فکر کا پردہ چاک کر دیا جائے اور اسلام کے خیاباں سے یہ کانٹا نکال پھینکا جائے۔ ... اور یہی نہیں بلکہ اپنے حق میں ایسی سخت بددعا کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے جو تعلقِ خاطر آپ کو تھا اس کے پیشِ نظر ان کا اپنے حق میں اس سے زیادہ سخت بددعا کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

اس لیے ضروری ہے کہ علامہ اقبالؒ کے تصوّرِ آخرت کو قرآنی آیات کی روشنی میں دیکھا جائے۔

اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید کے چوتھے خطبہ میں جو "خودی، جبر و قدر اور حیات بعد الموت" پر ہے۔ علامہ اقبال بعثتِ ثانیہ کا قرآنی تصوّر بیان کرتے ہوئے وحوش و طیور تک کی بعثتِ ثانیہ پر دلیل قائم کرتے ہیں؛

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"آئیے اب اس سلسلے میں قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔ قرآن نے تقدیرِ انسانی کا جو نظریہ قائم کیا ہے وہ کچھ تو اخلاقی ہے اور کچھ حیاتی۔ حیاتی اس لیے کہ قرآن پاک نے اس ضمن میں بعض ایسے اشارات کیے ہیں جن سے ہماری توجہ مظاہرِ حیات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور جن کا فہم جب ہی ممکن ہے کہ ہم اس کی کنہ اور ماہیت کے بارے میں بڑی دقّتِ نظر اور بصیرت سے کام لیں۔ مثال کے طور پر اس نے برزخ کا ذکر کیا ہے جسے گویا موت اور بعث بعد الموت کے درمیان توقف و انتظار کی ایک حالت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ بعینہٖ بعد الموت کا تصوّر بھی سرتاسر مختلف ہے اس لیے کہ قرآن پاک نے اس کی بنا بعیت کی طرح کی مخصوص انسان کی بعثتِ ثانیہ پر نہیں رکھی۔ وہ حیات کا ایک عالمگیر مظہر ہے جس کا اطلاق ایک حد تک وحوش و طیور پر بھی کیا جا سکتا ہے" [۱۱] (۳۸:۶)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (۳۸:۶) "زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو۔ یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ سب اپنے رب کی طرف جمع (حشر) کیے جائیں گے"۔

ظاہر ہے کہ جب علامہ اقبال بعثتِ ثانیہ کو حیات کا اس حد تک عالمگیر مظہر مانتے ہیں وہ قرآن پاک کی اس آیۂ مبارکہ سے وحوش و طیور تک کے حشر اور حیات بعد موت پر استدلال کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ عام انسان اس سے مستثنٰے قرار پائیں۔ اس وضاحت سے وہ اشکال بھی دور ہو جاتا ہے جو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کو اعمال بد کے مرتکبین کی باز پرس کے بارے میں پیدا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال کا ایک کتاب THE EMERGENCE OF LIFE پر تبصرہ بھی، جو ایک انگریزی ماہنامہ "THE MUSLIM REVIVAL" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا حیات بعد الموت کے ضمن میں آپ کے تصورات پر برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے:

"انسان کے مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا تصوّر یا نظریۂ حیات بعد موت مذہب کی تعلیمات کا ایک ایسا عنصر ہے جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بلکہ میں کہوں گا کہ ناقابلِ یقین راز ہے . . . . .

سائنسی دماغ کو یہ تصوّر محض واہمہ معلوم ہوتا ہے اور سائنس کے کسی طالب علم کو اس بات کا یقین آ ہی نہیں سکتا کہ اس کا جواز سائنس سے قطعی پیش کیا جا سکتا ہے لیکن زیرِ نظر (ریاضیاتی موضوع)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی روشنی میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تصور کو ممکنہ اور عقلی عقیدہ کی صف سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات خلافِ عقل تو معلوم ہوتی ہے (اگر ہم اس تصور کی ایک انتہائی عملی شکل یہ فرض کریں کہ ایک انسان (جو خندق میں بم پھٹنے سے پاش پاش ہو کر مر چکا ہے) اس کا جسم جن جوہری ذرات سے مرکب تھا وہ دوبارہ اسی طرح مجتمع ہو سکتے ہیں کہ مذکورہ انسان پھر زندہ ہو جائے مگر جو یا بنیادی موضوع اس وقت زیرِ بحث ہے اس کی روشنی میں وجودِ انسانی کے واحدے اور اکائیاں ان تمام واحدوں اور اکائیوں سے جو ان کے مادی ماحول کی حیات گاہ کا کام دے چکتے ہیں اسی طاقت کے زیرِ عمل ہیں جس نے انہیں پہلے مجتمع کیا تھا تو اس میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی۔[۱]

---

[۱] اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کی وہ تشریح بھی بڑی دلچسپ ہے جو سید نذیر نیازی صاحب کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال "رَبِّ اَرِنِی کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی" میں لفظ 'کَیْفَ' کی وضاحت کے سلسلے میں استفسار پر بیان فرمائی گئی تھی "اقبالؒ کے حضور" میں اِس تشریح کا بیان اس طرح ہے:

فرمایا "تمہارا اشارہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی طرف ہے کہ اے اللہ! تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟"

مَیں نے عرض کیا "جی ہاں! اسی سوال کی طرف"۔

ارشاد ہوا، اللہ تعالیٰ نے 'کَیْفَ' کا جواب 'صُرْھُنَّ' سے دیا اور 'صُرْھُنَّ' کا ترجمہ عام طور سے یہ کیا جاتا ہے کہ جانوروں کی تکہ بوٹی کردو۔ لیکن صُرْھُنَّ کے اس ترجمے سے کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی تکہ بوٹی کردی؟ ان کا ایک ایک جزو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیا اور انہیں پکارا تو وہ دوڑتے ہوئے ان کے پاس آگئے؟ 'کَیْفَ' کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہاں اگر 'صُرْھُنَّ' کے معنی ہیں سدھانا، راہ پر لگانا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ 'کَیْفَ' کا جواب مل گیا۔ فلسفیانہ اعتبار سے بہرحال مسئلہ یہ ہے کہ جواہر کی وہ ترکیب جو عبارت ہے وجودِ انسانی سے، کیا ایک دفعہ بکھر کر علیٰ حالہٖ پھر بھی قائم ہو سکتی ہے؟ سائنس کا جواب اس سلسلے میں اگر مثبت نہیں تو منفی بھی نہیں ہے اس کے امکان سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مَیں نے عرض کیا "لیکن اس میں ایک بات غور طلب ہے"۔

© rasailojaraid.com

فرمایا "کیا؟"

© rasailojaraid.com

اس فرنگی مفکر کی دلیل کو قرآنِ حکیم کے دلائل کے عین مطابق پا کر علامہ مرحوم نے قرآن کی مندرجۂ ذیل

"یہ کہ خلقِ اوّل تو ایک حقیقت ہے۔ انسان خود وجود میں آیا۔ دوسروں کو وجود میں آتا دیکھتا ہے لیکن خلقِ آخر کا فہم نہایت مشکل ہے، جیساکہ آپ نے خود بھی ارشاد فرمایا ہے۔"

فرمایا "کیسے؟"

"آپ کا ارشاد ہے کہ قرآنِ پاک نے اس حقیقت کو مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے۔ مثلاً زمین کا مُردہ ہو کر پھر روئیدگی حاصل کرنا۔ قرآنِ پاک نے یہ مثال پیش کی اور فرمایا "کذالک الخروج"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ عمل کیسے اور کہاں رونما ہوتا ہے؟"

ارشاد ہوا "حیاتی اعتبار سے تو ہم یہی کہیں گے کہ خلقِ اوّل کا عمل بطنِ مادر میں رُونما ہوتا ہے۔ آگے چل کر عالمِ کائنات اس کی جولان گاہ بنتی ہے۔ پھر اس کے لیے موت ہے، ایک گوشۂ زمین اور جسم کا انحلال و انتشار لیکن اس کے باوجود اس کی وحدت قائم رہتی ہے، لہٰذا وہ پھر زندگی حاصل کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر بطنِ مادر کی طرح بطنِ مرقد میں بھی ایک عمل رُونما ہوتا ہے اور یہی عمل ہے جس کی تکمیل پر اسے ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ وہ گویا بطنِ مادر کی طرح بطنِ مرقد سے باہر قدم رکھتا ہے۔" کذالک الخروج۔

حضرت علاّمہ کے ذہن میں اس وقت دراصل قرآن مجید کا یہ ارشاد تھا کہ نشأۃ اُولیٰ کی طرح ایک نشأۃ ثانیہ بھی ہے۔ انہوں نے بات ختم کی تو مَیں نے کہا "آپ فرماتے ہیں ذات انسانی کی ایک وحدت ہے اور یہ وحدت خودی کی وحدت ہے۔"

فرمایا "بے شک۔"

مَیں نے عرض کیا "یعنی شعُور کی وحدت، بالفاظِ دیگر شعورِ ذات کا تسلسل لیکن سائنس کی زبان میں گفتگو کی جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ جواہر میں شعُور کہاں سے آیا؟"

ارشاد ہوا "سائنس کی زبان میں ہم یُوں کہیں گے کہ شعُور وہ حقیقت ہے جو ان کے اندر پہلے ہی سے موجود تھی۔ شعُور ہی سے گویا ان کا وجود ہے۔ لہٰذا شعُور کا تسلسل حیات بعدالموت پر بھی قائم رہتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آیا ہے۔ قیامت کے روز کافر کہیں گے: لَوْ کَانَ کُنَّا کَرَّۃً۔

پھر فرمایا یہ سب ادائے مطلب کے طریق ہیں۔ قرآن پاک چاہتا ہے کہ ایک حقیقت بطورِ حقیقت ہمارے ذہن میں جاگزیں ہو جائے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیات کا حوالہ دیا ہے:

وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۝ أَوَآبَاؤُنَا
الْأَوَّلُونَ ۝ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَعْلُومٍ
... نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ۝ أَأَنْتُمْ
تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ۝ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝
عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ
الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ (۴۷-۶۲) (سورۂ واقعہ)

"وہ کہتے تھے: کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اے نبی، ان لوگوں سے کہو یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر ہے۔ ... ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں۔ ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو۔ پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟"

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۔
قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ
الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ (سورۂ عنکبوت: ۱۹-۲۰)

"کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے، یقیناً (یہ اعادہ) تو اس کے لیے آسان تر ہے۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔ پھر اللہ بارِ دگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ ۝
(القیامہ: ۳)

"کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے۔ کیوں نہیں ہم ٹھیک کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتے ہیں اس کی پوریاں"۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا o قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا o اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ ج فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ط قُلِ الَّذِىْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ج (بنی اسرائیل: ۴۹-۵۰)

"وہ کہتے ہیں جب ہم ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔ ان سے کہو تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ، یا اس سے بھی زیادہ سخت چیز، جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو۔ وہ ضرور پوچھیں گے کہ کون ہے جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا۔ جواب میں کہو وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا۔"

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا o اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا o (سورۂ مریم: ۶۶)

"انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یہ یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔"

قَالُوٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ o لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ o قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ط قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ o

. . . . حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ o لَعَلِّىْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ط اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ط وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔ (المومنون: ۸۲-۱۰۰)

"یہ کہتے ہیں کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض ایک افسانۂ پارینہ ہے۔ ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی۔ کہو پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے۔ . . . . . . یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے یہاں تک کہ جب ان میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی کی موت آئے گی تو کہنا شروع کر دیں گے کہ اے میرے رب مجھے اس دنیا میں واپس بھیج دیجیے جسے میں چھوڑ کر آیا ہوں ۔ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کرونگا ۔ ہرگز نہیں، یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے ۔ ان سب کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے، دوسری زندگی کے دن تک۔"

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کا تصورِ آخرت ٹھیٹھ اسلامی اعتقادات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ موت اور حیات بعد موت کو وہ ایک سادہ عالمگیر حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں ۔ اس ضمن میں ان کے نظریات معلوم کرنے کے لیے ان کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" خاص طور پر مطالعہ کرنی چاہیے۔

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیمِ ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

. . . .

خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

. . . .

پھر یہ انساں آنسوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمعِ روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے
جس کا ناخن سازِ ہستی کے لیے مضراب ہے
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موت وحیات کے عالمگیر مشاہدے سے علامہ اقبالؒ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ موت بلاشبہ عالمگیر اور اٹل ہے لیکن اس کائنات میں نقشِ حیات مٹ مٹ کے اُبھرتا ہی رہتا ہے۔ اس لیے مرنے سے نہ تو خوفزدہ ہونا چاہیے اور نہ ہی محزون و دلگیر، کیونکہ جب ایک ننھا بیج بھی پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے تو آخر مرقدِ انسان کی شب کا انجام صبح کیوں نہیں ہو گا[۱۳]

تخمِ گُل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بیخواب ہے — کس قدر نشوونما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے — خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں — خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ — موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے!
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

حیات بعد موت پر علامہ اقبالؒ کے دلائل قرآن ہی کی دلیل سے ماخوذ ہیں۔ قرآنِ حکیم نے بارش کے ذریعے مُردہ زمینوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے عالمگیر مظاہر کو کئی مقامات پر انسان کی نشأۃ ثانیہ پر دلیل ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مرنے والوں کے غم سے اگرچہ انسان کا دل آباد رہتا ہے اور مرنے والوں کا زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے بھی مندمل نہیں ہوتا، تاہم انسان کی فطرت میں یہ ایک احساسِ نامعلوم پایا جاتا ہے کہ جوہرِ آدم موت سے بھی فنا نہیں ہوتا[۱۴]۔ اس کا وجدان اسے بتلاتا ہے کہ موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔

آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے — اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے
جوہرِ آدم عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

بعض اوقات خود انسان کی عقل بھی رفتہ رفتہ انسان کو اس وجدانی کیفیت تک پہنچا سکتی ہے کہ حیات بعد موت ایک حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبالؒ نے میکٹگرٹ کے صوفیانہ تجربات کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ایک بار اپنی بیوی سے کہا تھا "مجھے جُدائی کا غم ضرور ہے لیکن مجھے موت کا قطعاً کوئی خوف نہیں ہے۔" علامہ اقبالؒ میکٹگرٹ کے اس جُملے کو "ایمانِ فاتح" سے تعبیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں جو "براہِ راست کشف" ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اس "وارداتِ قلبی" کو علمِ نفسیات کی اصطلاح "جذبہ" سے دُور کا بھی تعلق نہیں اور وہ اسے مسٹر میکٹگرٹ کے الفاظ میں ایک "حقیقی حسی اِدراک" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقت کا یہ صُوفیانہ کشف انہیں اپنے فکر کی تصدیق کے طور پر حاصل ہوا تھا اور عقلِ محض نے اسے جس نتیجہ تک پہنچا دیا تھا یہ حادثاتی تصدیق اسی کے نتیجہ میں ایک "کشف" کی صورت میں اسے حاصل ہو گئی[۱۵]۔

اب یہ سوال ہے کہ علامہ اقبالؒ حیاتِ دوام کو کن معنوں میں بالفعل نہیں بلکہ بالقوہ مانتے ہیں اور انسان کو اس کا امیدوار محض ٹھہراتے ہیں جو اسے اپنے عمل اور خدا کے فضل کی بدولت حاصل کر سکتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ان کے دستورِ خودی سے گہری واقفیت درکار ہے۔ خود علامہ اقبالؒ مثنوی اسرارِ خودی (اشاعتِ اوّل ۱۹۱۵ء) کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیّل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذّتِ حیات "انا" کی "انفرادی حیثیت" اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ حیات بعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا"[۱۶]

علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودی ہی حقیقتِ اولیٰ ہے اور موت و حیات خودی کے احوال ہیں اور کچھ نہیں، لہٰذا زندگی کا مقصد فقط یہ ہے کہ عملِ صالح اور عملِ حسن سے خودی کی نشوونما کی جائے۔ ایک مردِ مومن کو صرف اپنی خودی کی فکر ہوتی ہے موت کی نہیں۔ کیونکہ وہ اسے خودی کی زندگی میں ایک لمحہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق ... فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

او خود اندیش است و مرگ اندیش نیست ... مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

قرآنِ حکیم میں آتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک)۔

اس لیے اصل اہمیت حُسنِ عمل کو حاصل ہے نہ کہ موت و حیات کو۔ حضرت علامہ کے نزدیک قرآنِ حکیم فکر سے زیادہ عمل پر زور دیتا ہے[۱۷] کیونکہ صرف عمل ہی میں انسان کی پوری شخصیت بروئے کار آتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس سے اس کی نشو و نما ممکن ہوتی ہے شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اس کے مندرجہ ذیل پہلو درجہ وار سامنے آتے ہیں۔

- حیاتی ... ... خوراک، لباس اور رہائش
- عمرانی حیاتی ... ... ازدواج اور بقائے نسل
- عمرانی ثقافتی ... ... تعلیم اور کسبِ معاش
- نفسیاتی ... ... ارادہ، جذبہ اور ادراک
- انفسی ... ... شعور و لاشعور
- ماورائی ... ... تعلق باللہ، اخلاقی عمل اور حیات ما بعد الموت

مذہب کے نزدیک انسانی شخصیت کا ماورائی پہلو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور ارتقائی نقطۂ نظر سے انسان کی آئندہ ترقی کی منازل اسی پہلو سے ممکن ہیں۔ جب ماورائی حقائق زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں تو شخصیت کے تمام دوسرے پہلو اس سے متاثر ہوتے ہیں اور شخصیت میں ایک تناؤ اور مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ اور نفسیات کی زبان میں علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسانی زندگی میں خودی کے ارتقائی مدارج شعور، خود شعوری اور خدا شعوری ہیں اور انہی سے زندگی اور موت کی میزان پر انسان کا درجہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

زندہٗ یا مردہٗ یا جاں بلب ... از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن ... خویش را دیدن بنورِ خویشتن ... شعور
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے ... خویش را دیدن بنورِ دیگرے ... خود شعوری (امتیازِ من و تو)
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق ... خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق ... خدا شعوری
پیش ایں نور ار بمانی استوار ... حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
بر مقامِ خود رسیدن زندگی است ... ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مردِ مومن در نسازد با صفات ... مصطفےٰ راضی نشد الا بذاتﷺ

نفسیات کی زبان میں انسان کا امتیازی وصف "خود شعوری" ہے، جسے علامہ اقبال "شعور کا روشن نقطہ" کہتے ہیںؒ لیکن قرآن کے نزدیک انسان کی خود شعوری خدا شعوری کے ساتھ مشروط ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے لفظوں میں انسان اپنی حقیقی خودی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ تعلق باللہ قائم نہ کرے اور اپنے شعور کو اللہ کی یاد کا کاشانہ نہ بنا لے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ط (الحشر: ۱۹)

"اور ایسے لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا پس وہ اپنے آپ کو ہی بھلا بیٹھے"۔

علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی میں یہی حکمت ہے۔ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح کے پردے میں ان کا پیغام ہر اس شخص کے لیے ہے جو خدا فراموشی کی وجہ سے خود فراموشی میں مبتلا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے انسانی سطح سے پست تر سطح پر زندگی بسر کرنا لازم آتا ہے۔ انسان کو اپنی خودی کا حقیقی تجربہ صرف عشق کی ایسی صورت میں ہی ممکن ہے کہ خدا کا تصوّر اور خدا کی محبت اس کے شعور پر پوری طرح چھا جائے اور شاخِ گل میں بادِ سحر گاہی کے نم کی طرح اس کے ریشے ریشے میں سما جائے۔

پس خدا کو یاد رکھنا اپنے آپ کو یاد رکھنا ہے اور خدا کے ہاں اپنے نشوونما کا سامان کرنا ہے۔ (فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ)، اور اسے پانا گویا اپنے آپ کو پانا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم اگر ایک طرف خدا کی یاد کو حرزِ جاں (وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ) بنانے کی تلقین کرتا ہے تو دوسری طرف معرفتِ نفس کے ذریعے آیاتِ الٰہی کے مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے۔

وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

"اور خود تمہارے نفس کے اندر (اس کی آیات ہیں) تم کیوں نہیں دیکھتے"۔

علامہ اقبالؒ کا درس خودی انہی آیاتِ قرآنی کی تصریح و توضیح ہے۔

جب ذکر و فکر کی کثرت سے خدا کی محبت انسان کی خود شعوری میں راسخ ہو جاتی ہے تو انسان کی ماورائی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جسے اقبالؒ "سفر در خویش"، "زادن بے اب و اُم"، "از سُو بہ بے سُوئی خرام"، "بیداری جاں"، "انقلاب اندر شعور" وغیرہ کے نام دیتا ہے۔ یہ حیاتی سطح پر نہیں بلکہ ایک نئی شعوری سطح پر زندگی کا آغاز ہے جسے ایک نئی ولادت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اس زمان و مکان کی قید سے انسان کو رہا کر سکتی ہے اور انسان کو حقیقی معنوں میں مادّی جبر سے نجات دلا کر اسے اختیار دلاتی ہے۔

سفر در خویش زادن بے اب و مام | ثریا را گرفتن از لبِ بام | (زبورِ عجم)
عاشقی از سُو بہ بے سُو خرام | مرگ را بر خویشتن کردن حرام | (جاوید نامہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

از شعور است این که گوئی نزد و دُور — چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور (جاوید نامہ)

غرض یہ کہ حیات کے کئی درجے ہیں اور ان درجوں کے اعتبار سے حیات و موت ان کے نزدیک اعتباری احوال ہیں[۲۵]۔ مثلاً موسیقی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک بہرہ آدمی مُردہ ہے کیونکہ وہ لذتِ صوت وصدا سے بے بہرہ ہے[۲۶]۔ اسی طرح ایک اندھا شخص جو روشنی اور رنگ سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، روشنی اور رنگ کے اعتبار سے زندہ درگور ہے[۲۷]۔ بعینہٖ جو شخص خدا شناس نہیں ہے وہ رُوحانی اعتبار سے بالکل مُردہ ہے وہ حیوانی اعتبار سے زندہ بھی لیکن "حیاتِ مطلق" سے اُسے کوئی حصّہ نہیں ملا[۲۸]۔

مُردن و ہم زیستن اے نکتہ رس — این ہمہ از اعتبارات است و بس
ماہیاں را کوہ و صحرا بے وجود — بہرِ مرغاں قعرِ دریا بے وجود
مردِ کر سوزِ نوا را مُردہ — لذتِ صوت و صدا را مُردہ
پیشِ چنگے مست و مسرور است کور — پیشِ رنگے زندہ درگور است کور
روح با حق زندہ و پائندہ است — ورنہ این را مُردہ آں را زندہ است
آنکہ حیّ لایموت آمد حق است — زیستن با حق حیاتِ مطلق است
ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست — گرچہ کس در ماتمِ او زار نیست

(زبورِ عجم)

واضح رہے کہ علّامہ اقبال کے یہ نظریات کسی فلسفیانہ اپج یا شاعرانہ ترنگ کا ماحصل نہیں بلکہ خالص قرآنی تعلیمات ہی ہیں۔ قولِ ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸:۲۴)

(اے ایمان والو! خدا اور رسُول کی پکار کو قبول کرو جب وہ تم کو اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندہ کرتی ہے۔)

گویا قرآنِ حکیم کی اس آیت کے مصداق اس دنیا میں بھی ایک نئی قسم کی زندگی کا حصُول ممکن ہے یہ ایک قسم کا نیا ذوقِ حیات ہے جس کے ذریعے آخرت کی زندگی کا ذائقہ چکھا جا سکتا ہے۔

حیات بعد الموت کی ماہیت کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

"قرآنِ مجید نے بعث بعد الموت کے بارے میں جن ماثلتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے مقصود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ بعثتِ ثانیہ ایک حقیقت ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے[۲۹]۔"

اس میں شک نہیں کہ قرآنِ حکیم میں آخرت کی زندگی کا نقشہ بڑی تفصیل سے کھینچا گیا ہے اور اس میں جو رنگ آمیزی کی گئی ہے اس میں اس دنیا (یعنی موجودہ سطح کی حیاتی سطح) کی زندگی کا رنگ نہایت گہرا ہے تاہم بعض مقامات پر قرآنِ حکیم نے نہایت واضح اشارے کر دیتے ہیں کہ آخرت کی زندگی کو اس دنیا کی زندگی پر قیاس نہ کیا جائے۔ مثلاً:

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ (۱۴ : ۴۸)

"جس روز زمین ایک غیر ارضی حالت میں بدل دی جائے گی۔

وَ نُنۡشِئَکُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (واقعہ - ۶۱)

"اور تمہیں ایسے جہاں (یا ایسی حالت میں) پیدا کر دیں جس کے متعلق تم کچھ نہیں جانتے۔"

وَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (السجدہ)

"پھر آنکھوں کی ٹھنڈک کا جیسا کچھ سامان ان کے اعمال کی جزاء کے طور پر ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں۔"

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کے لیے وہ کچھ فراہم کر رکھا ہے جسے کبھی نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کبھی کسی کان نے سنا اور نہ کوئی انسان اس کا تصور ہی کر سکا۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

فروغِ دانشِ ما از قیاس است | قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد | سکون و سیر و کیف و کم دگر شد[۳۰]

باوجودیکہ آخرت کی زندگی جو ایک سراسر نور اور روحانی عالم ہے اور ہمارے تصور سے بھی ماوراء ہے تاہم قرآنِ حکیم میں ایک جگہ اس بات کا ذکر بھی موجود ہے کہ اہلِ جنت کو جو میوے کھانے کے لیے دیئے جائیں گے انہیں چکھنے کے بعد انہیں محسوس ہو گا اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ایسے میوے تو ہم نے حیاتِ ارضی میں بھی کھاتے تھے[۳۱] (۲: ۲۵) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جنت کی زندگی کا ذوق اس زندگی میں بھی پیدا کیا جا سکتا ہے اور آخرت کی اس ابدی اور نورانی زندگی کا آغاز اسی دنیا سے کیا جا سکتا ہے اور یہ عقل کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع رکھنے سے ممکن ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شب و روزے کہ داری برابد زن — فغانِ صبحگاہے بر خرد زن
خرد را از حواس آید متاعے — فغاں از عشق می گردد شعاعے
خرد جزرا فغاں کُل را بگیرد — خرد میرد فغاں ہرگز نمیرد

قرآن کی متعدد آیات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے حیوانی سطح کی ظلمانی زندگی میں بھی رُوحانی زندگی کا نُور پیدا کیا جا سکتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ۙ وَّ سَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا ۝ ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝ (۳۳ : ۴۱ - ۴۳)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اللہ مومنوں پر رحیم ہے۔"

قرآنِ حکیم اسی نورانی زندگی کو حقیقی زندگی سے موسُوم کرتا ہے جسے انسان کو اس دنیا میں حاصل کرنا چاہیے۔

اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَ جَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَا ؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْکٰفِرِیْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۶ : ۱۲۳)

"کیا وہ شخص جو مُردہ ہو پھر ہم اُسے زندگی بخشیں اور بینائی عطا کریں جس سے وہ لوگوں میں دبلا روک چلنے پھرنے لگے، ایسے شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو ہمیشہ تاریکیوں میں بھٹکتا رہے اور ان سے نکل جانے کی کوئی راہ نہ پائے۔ اسی طرح کافروں کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیئے گئے"

علامہ اقبالؒ بھی اسی لیے خودی کی حقیقت کو نوری قرار دیتے ہیں۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است — زیرِ خاک ما شرارِ زندگی است
چراغے درمیانِ سینۂ تُست — چہ نور است ایں کہ در آئینۂ تست؟

چنانچہ ظاہر ہے کہ جس شخص میں تعلق باللہ کا داعیہ پیدا ہو اس کی شخصیت کا ماورائی پہلو نشوونما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے محروم رہتا ہے۔ آخرت کی نورانی زندگی سے اسے کوئی حصّہ نہیں مل سکتا اور اس اعتبار سے وہ بالکل مُردہ ہے خواہ اس کے لیے کوئی ماتم کناں ہو یا نہ ہو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد گرامی ہے کہ اس شخص کی مثال جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اس شخص کی سی ہے جس میں زندگی پائی جاتی ہے اور اس شخص کی مثال جو اللہ کو یاد نہیں کرتا ایسی ہے جیسے کوئی میّت۔

ہر کہ بے حق زیست جز مُردار نیست　　گرچہ کس در ماتم او زار نیست

زندگی درحقیقت ہے ہی وہی جس میں خدا کا قرب نصیب ہو کیونکہ اس میں حیاتِ جاوداں کا سراغ ملتا ہے ؎

زندگانی نیست تکرار نفس　　اصلِ او از حی و قیوم است و بس

قرب جاں با آنکہ گفت "انّی قریب"　　از حیاتِ جاوداں بُردن نصیب

قربِ حق کی زندگی میں ایک مردِ مومن جس ماورائی ذوقِ حیات یعنی اپنے جس نور کے ساتھ دنیا کے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، یہی نور موت کے بعد بھی اس کا رہنما بنتا ہے اور اس کی اخروی زندگی کی راہوں کو منوّر کرتا ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۵۷: ۱۲)

اور ایک دوسرے مقام پر اہلِ جنّت کے لیے لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ (۱۹: ۲) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ گویا پچھلی زندگی کے اعمال پر اجر کے علاوہ ایک اور زندگی کا پروگرام بھی جاری ہو گا۔ آخرت دار الجزا ہی نہیں بلکہ ایک ایسی نورانی زندگی ہے جسے پا کر بھی اس کی مزید تکمیل کی خواہش آخرت میں بھی جاری رہتی ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ط عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لا يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (۶۶: ۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل سے، امید ہے کہ تمہارا رب دور کرے تم سے تمہارے گناہ اور داخل کرے تمہیں جنت میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جس دن کہ اللہ رسوا نہ کرے گا نبی کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اس کے ساتھ۔ اُن کا نور دوڑتا ہے اُن کے آگے اور ان کے داہنے کہتے ہیں اے رب پورا کر ہمارے لیے نورا اور ہمیں بخش دے، تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

اگر اُخروی زندگی ایک نورانی سطح کی زندگی ہے اور اگر وہاں ارتقا کا رُخ بھی تکمیلِ نور کی طرف ہے تو جو لوگ شقاوتِ قلبی اور بدعملی کی وجہ سے اِس دنیوی زندگی میں اس نور سے محروم رہ جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو حیاتِ جاودانی کی سعادت سے محروم کر لیتے ہیں۔ یہ خودی کی ہلاکت ہے۔ دنیوی زندگی گویا اُخروی زندگی کی تیاری ہے۔ جو بدنصیب اس دنیا میں اُخروی نورانی زندگی کا ذوق پیدا نہیں کر پاتا وہ اُخروی زندگی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ دنیا کا اندھا آخرت میں بھی اندھا ہی رہتا ہے۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۷۲)

"اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔"

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔ (۱۸-۱۹)

"جو کوئی عاجلہ کا خواہشمند ہو، اُسے بھی ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی دنیا میں چاہیں، پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور جنت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لیے سعی بھی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور وہ ہو مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔"

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (شوریٰ-۲۰)

"جو شخص آخرت [illegible] اضافہ کر دیتے ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو شخص دُنیا ہی کی منفعتوں کی خواہش کرے ہم اُسے اس ہی سے کچھ دے دیتے ہیں اور آخرت میں اُسے کچھ نہیں ملتا"

یہ بے بصیرت لوگ جنہوں نے آخرت کے مقابلے میں اسی دنیا کی زندگی پر قناعت کر لی وہ آخرت کے اعتبار سے ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ جب یہ فرماتے ہیں کہ "حیات بعد الموت انسان کا حق نہیں وہ اس کا محض امیدوار ہے[۳۲] اگر وہ اپنی ایمان و عمل کی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تو وہ آخرت کی نورانی زندگی کو حاصل کر سکتا ہے اور اگر وہ اپنی شخصیت اُخروی حیات کی مناسبت سے ترتیب نہ دے تو وہ ہلاک بھی ہو سکتا ہے" تو وہ درحقیقت انہی قرآنی حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ - (۱۴ : ۲۷)

" اللہ تعالیٰ مومنوں کو "قولِ ثابت" کے ذریعے اس دنیا میں بھی ثبات بخشتا ہے اور آخرت میں بھی"

اس لیے علامہ اقبالؒ بعثت بعد الموت کو "خارجی حادثہ" نہیں مانتے بلکہ "خودی کی زندگی کا ایک اندرونی عمل" قرار دیتے ہیں شخصی ابدیت (بقائے دوام) آپ کے نزدیک کسی کیفیت (STATE) کا نام نہیں بلکہ ایک عمل (PROCESS) ہے[۳۳]

اس لیے اگر "قولِ ثابت" سے خودی کو ثبات دیا جائے تو موت کا صدمہ بھی اسے تحلیل نہیں کر سکتا۔

ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است　　　　خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　　　یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے

چنانچہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا 'اجرِ غیر ممنون' اس کی خودی کا ایسا ثبات ہے جس سے خودی کی فعالیت زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرتی چلی جائے، حتیٰ کہ عالمگیر تباہی کا وہ ہولناک منظر بھی جس سے قیامت کی ابتدا ہو گی۔ تربیت یافتہ خودی کے سکون و اطمینان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو گا۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط (۳۹ : ۶۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قسم کے استثناء کا اطلاق انہیں شخصیتوں پر ہو سکتا ہے جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو اس لیے خودی کی نشوونما کا معراجِ کمال یہ ہے کہ ہم خدا کی خودی سے براہِ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے، اپنے آپ کو قائم و برقرار رکھ سکیں جیسا کہ قرآن پاک میں حضور سرورِ کائنات کے مشاہدۂ ذات کے بارے میں ارشاد ہے:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی

اقبالؒ کے نزدیک انسانیتِ کامل کا اسلامی تصور یہی ہے جسے ایک فارسی شعر میں یوں بیان کیا گیا ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی[۳۵]

خودی کو یہ ثبات عطا کرنے والا قولِ ثابت کیا ہے، کلمۂ طیبہ، جسے اعمال رفعت بخشتے ہیں (الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ[۳۶])۔ اس کلمہ طیبہ کو علامہ اقبالؒ "خودی کا سرِ نہاں" (خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ) قرار دیتے ہیں جو قرآنی تمثیل کے الفاظ میں ایک ایسا پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اُتری ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو ہر آن پھل لا رہا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق انسان کا ہر اچھا عمل جنت میں ایک درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہاں پھل لاتا ہے۔ ایک اور حدیث میں معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا، بہشت میں بہت وسیع جگہ خالی ہے اس لیے اُمتِ مُسلمہ کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کے کلمات کو پڑھ کر درخت لگائیں۔ چنانچہ بعض مسلمان فلاسفہ کے نزدیک جنت و دوزخ درحقیقت عالمِ امثال میں انسانی اعمال کی حقیقت ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں علامہ اقبالؒ کا اشارہ اسی طرف ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اہلِ دُنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

پیش آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گذار
زاں کہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

بچتے نہیں بخشنے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تیری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

چنانچہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسان کی اصل شخصیت کوئی "چیز" نہیں بلکہ ایک "فعل" یا "عمل"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے عبارت ہے۔ انسان کا تجربہ ایسے افعال کا سلسلہ ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور جن کی شیرازہ بندی ایک حکمران مقصد سے ہوتی ہے۔ علّامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :

"میری شخصیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے ایک شے سمجھیں۔ اعمال و افعال کا وہ سلسلہ جس میں ہر عمل دوسرے پر دلالت کرتا ہے اور جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں تو اس لیے کہ ان میں کوئی رہنما مقصد کام کر رہا ہے۔ میری ساری حقیقت میرے اس امر آفریں رویّہ (یعنی فعالیّت و قدرت) میں پوشیدہ ہے۔ میں کوئی شے نہیں کہ آپ ایک شے مکانی کی طرح میرا ادراک کریں یا یہ ترتیبِ زمانی واردات کے ایک مجموعے کی طرح میرا جائزہ لیں۔ اگر آپ سچ مچ مجھ کو جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو مجھے دیکھنا ہوگا کہ میں جب کسی چیز پر حکم لگاتا یا کوئی ارادہ کرتا ہوں تو اس میں میرا رویّہ کیا ہوتا ہے میرے مقاصد کیا ہیں اور میری تمنائیں کیا۔ یوں ہی آپ میری ذات کی ترجمانی کرکے مجھ کو سمجھیں اور جان لیں گے۔"[36]

گویا انسان کی شخصیت اس کے قوائے عمل کی ایک خاص ترتیب اور ایک خاص جہت ہے جسے قرآن شاکلتہ (کل یعمل علیٰ شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھواھدیٰ سبیلاً) کا نام دیتا ہے۔ بقول اقبال" انسان ایک فعالیت (ENERGY) ہے۔ ایک قوتِ عمل (FORCE) بلکہ قوائے عمل جو مختلف ترتیبوں میں منظم ہو سکتے ہیں۔ اور قوائے عمل کی ایک معیّن ترتیب ہی سے شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ یہ شخصیت کیونکہ معرضِ وجود میں آتی ہے اس سے غرض نہیں بلکہ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا یہ ترتیب قوائے انسانی (شخصیت) جو ہمیں اس قدر عزیز ہے اپنی موجودہ شکل کو برقرار بھی رکھ سکے گی یا نہیں"[37]۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے ؟
کہ مَیں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے ؟

علّامہ اقبالؒ کے نزدیک یہ عین ممکن ہے کہ قوائے عمل (یعنی انسان کی شخصیّت) اُسی سمت میں کام کرتے رہیں جس میں یہ اپنی موجودہ ذی حیات اور صحت مند شخصیّت کی صورت میں کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کی شخصیّت کو قوائے عمل کے ایک ایسے معین دائرے سے تعبیر کرتے ہیں جو اپنے قوائے ترکیبی کی ایک معینہ ترتیب (شاکلہ) کے برہم ہو جانے سے معدوم بھی ہو سکتا ہے اس لیے ایسے اعمال کے ذریعے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو معینہ دائرہ شخصیت کے قوائے ترکیبی کو مستحکم بناتے ہیں، خودی کو لازوال بنایا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک منہائے خیر شخصیت ہے جو انسان کی عزیز ترین متاع ہے اور اسی کے معیار پر ہمیں اپنے تمام اعمال کو پرکھنا چاہیے۔ چنانچہ جو چیز ہمارے اندر احساسِ شخصیت کو ابھارے خیر اور نیکی ہے اور جو اسے دبائے یا اسے تباہ کرنے کا میلان رکھتی ہو وہ شر اور بدی ہے۔ اس لیے شخصیت کے لیے ایک استحکام بخش انداز زندگی اختیار کر کے ہم درحقیقت موت (یعنی وہ صدمہ جو انسان کے ان قوائے ترکیبی کو تحلیل کر دیتا ہے جسے ہم شخصیت کا نام دیتے ہیں) کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ اس لیے شخصی بقائے دوام کے حصول کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا شخصی بقائے دوام ہماری اپنی کوشش (یعنی ایک ماوراتی مدعائے حیات کے پیشِ نظر ایک نقطہ پر مرتکز کرنے) پر منحصر ہے۔ زندگی درحقیقت وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے لاانتہا موانع میسّر آتے ہیں۔ موت وہ پہلا امتحان ہے تاکہ انسان یہ دیکھ سکے کہ اسے اپنے اعمال و افعال کی شیرازہ بندی بمعنی بفحوائے آیہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، ایک ماوراتی مدعائے حیات کے پیشِ نظر ایک نقطہ پر مرتکز کرنے) میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں، یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔[۱۲]

قرآنِ حکیم میں دوزخیوں کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ موت ان پر ہر طرف سے چھائی رہے گی لیکن وہ مرنے نہ پائیں گے۔

وَیَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّمَا ھُوَ بِمَیِّتٍ ط (ابراہیم)

"حیاتی" اعتبار سے وہ زندہ بھی لیکن "اخلاقی اعتبار" سے (یعنی بہ اعتبارِ شخصیت وہ مُردہ ہوں گے یعنی لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی (نہ مردہ نہ زندہ)، لیکن اس کے برعکس اہلِ جنت کے بارے میں قرآن حکیم فرماتا ہے لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْھَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَۃَ الْاُوْلٰی ج وَوَقٰھُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ۔ (۴۴ : ۵۶)

اس موت کے بعد جو اس دنیا میں ان پر آئی، پھر ان پر موت وارد نہیں ہو گی۔ غالباً اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرتؐ کے وصال پر آپ کے چہرۂ مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

"میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ خدا کی قسم آپ پر اللہ تعالیٰ دو موتیں کبھی جمع نہیں کرے گا۔ جو موت آپ کے لیے لکھی جا چکی تھی وہ آپ نے چکھ لیا۔ اب ابد تک موت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کا دامن نہ چھو سکے گی۔"[۳۹]

ایک اور جگہ بھی قرآن حکیم شہداء کے لیے موت کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرماتا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○

اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں:

"حیاتِ اخروی انسان کے ذوقِ حیات کی شدت پر منحصر ہے۔ جس قدر کسی شخص میں ذوقِ زندگی (روحانی اور اخلاقی زندگی نہ کہ حیاتی زندگی) زیادہ ہو گا اتنا ہی اس کا زمانہ برزخ کم ہو گا۔ شہداء کا ذوقِ زندگی چونکہ بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے اس لیے ان کے لیے کوئی برزخ نہیں۔ اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی ان کے لیے دوسری زندگی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔"[۴۰]

علامہ اقبالؒ نظریہ بقائے دوام کو مولانا رومی کے ہمنوا ہو کر ارتقائے حیات ہی کا ایک مسئلہ ٹھہراتے ہیں اور اس کو مابعد الطبیعی دلائل کی بنا پر نہیں قائم کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسے قرآنی روح کے عین مطابق پاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم انسان اپنے ارتقاء کی جس منزل میں ہیں اسے نفسیاتی یا عضویاتی جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے ہمارے ارتقاء کی آخری منزل نہیں ہے۔ قرآن کی آیت لتوکبن طبقاً عن طبقٍ کے مصداق انسان کے لیے ابھی مراحلِ حیات طے کرنا باقی ہیں۔ چنانچہ مردِ مومن کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے ایسی موت نصیب ہو جو اسے موجودہ خاکی سطح سے بلند کر دے۔

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک
آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

دوسری طرف قرآن حکیم نے ایک مقام پر ایک ایسا اشارہ بھی کیا ہے کہ انسان کے لیے یہ عین ممکن ہے کہ وہ بندۂ حرص و ہوا بن کر (موجودہ حیاتی سطح سے بلند نہ ہو سکنے کے باعث) ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی ارضی زندگی پر رک جائے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰہُ بِهَا وَلٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىہُ (الاعراف)

"وہ خلود الی الارض" والی شخصیت کہ جو روحانی زندگی کو قرآن حکیم ایک کتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ حیوانی سطح کی زندگی انسان کے لیے جہنم سے کم نہیں۔ موت کے بعد اگر حیاتی زندگی میسّر بھی آجائے اور وہ نورانی زندگی جسے علامہ اقبالؒ شخصیت یا خودی کا نام دیتے ہیں، سے انسان محروم ہو جاتے تو ایسے انسان کو زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کو انسان اور خدا کے مابین معاملہ کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں :

انسان :

من چسا در بند تقدیرم؟ بگو!
تو نہ میری، من چرا میرم؟ بگو!

خُدا :

بودہ اندر جہانِ چار سُو
ہر کہ گنجد اندرو میرد درُو
زندگی خواہی خودی را پیش کُن
چار سُو را جذب اندر خویش کُن

غرض درجے (STAGE OR DEGREE) اور فضیلت (EXCELLENCE) کے اعتبار سے آخرت کی نورانی زندگی موجودہ دنیاوی زندگی سے کہیں اعلیٰ تر ہے اور ایک نئی زندگی نہیں بلکہ حقیقی زندگی ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا (۱۷:۲۱)
وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۔ (العنکبوت) ۔

'حیات' کے مقابلے میں 'حیوان' کا لفظ شدت پر دلالت کرتا ہے بقولِ اقبال :

ع فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے

(باقی)

© rasailojaraid.com